سیاست میں میرا آدرش فقط عوام کی خدمت ہے!

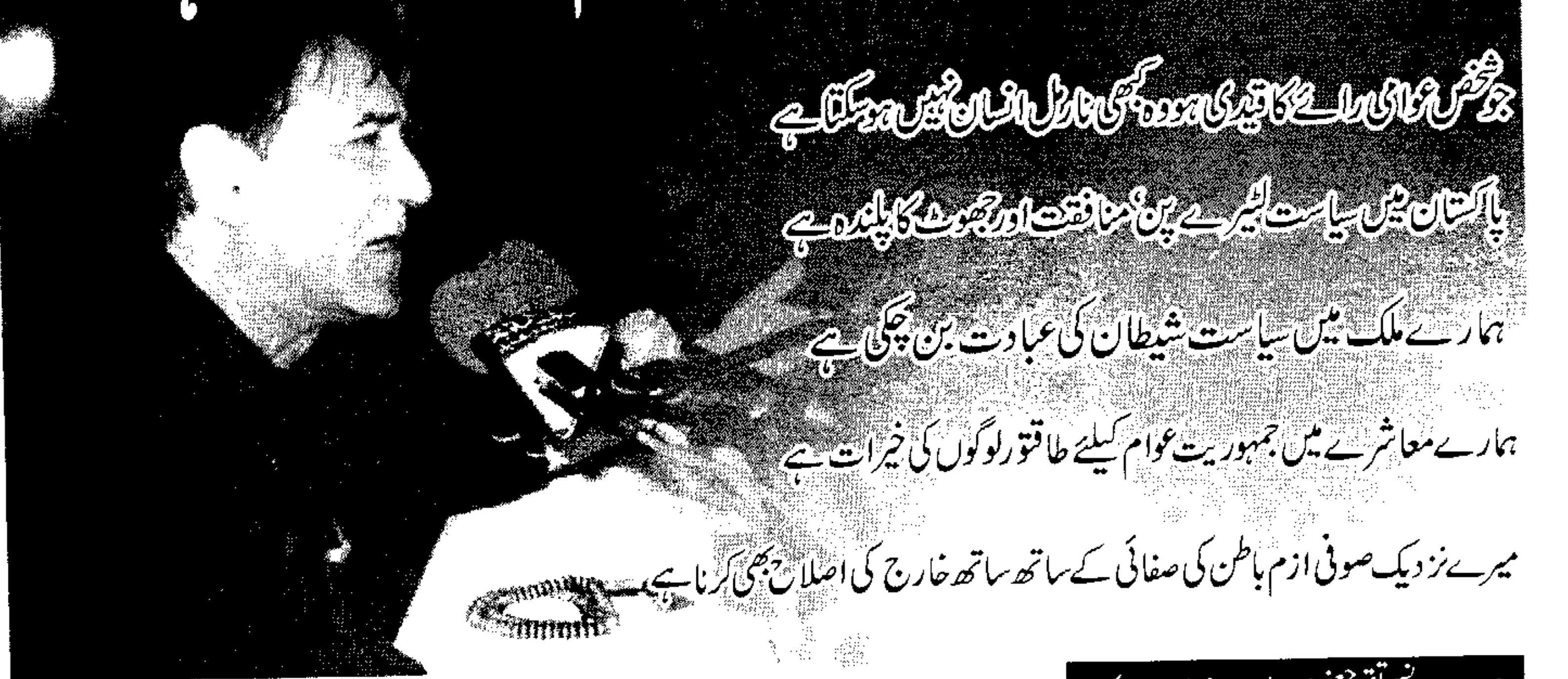

انٹرویو: سید نسیم تقی جعفری / عکاسی: محمد آصف ملک

سر ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ ایک سال سے مسلسل ''ادراک'' کی علمی اور ادبی سرپرستی فرما رہے ہیں اور ہماری دعا ہے کہ آپ اسی طرح ہماری سرپرستی فرماتے رہیں اور ہم ''ادراک'' کے خوبصورت شمارے چھاپتے رہیں۔ ''ادراک'' کے قارئین ہم سے جب بھی کسی خوبصورت موضوع کی Demand کرتے ہیں تو ہم انکی فرمائش اور آرزو کے احترام میں آپ کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں اور آپ سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہمارے قارئین کو آپ کے انٹرویوز کا شدت سے انتظار ہوتا ہے آج ہم اپنے فہمیدہ قارئین کی فرمائش کے مطابق جس نئے موضوع پر آپ سے گفتگو کریں گے وہ سیاست ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سیاست پوری زندگی پر محیط ایک وسیع موضوع ہے اور یہ انسانوں ہی سے وابستہ ہے لہٰذا ہم آج اس حوالے سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔

ادراک: میں سب سے پہلے آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ سیاست کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور ہمارے ملک میں سیاست کس رنگ میں ہے اور اب کس سمت اس کا سفر جاری ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب شکریہ! آپ نے میرے لیے بڑے اچھے الفاظ استعمال کیے۔ خدا کرے کہ میں ان الفاظ کا سزاوار ہو سکوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ سیاست ہی نہیں بلکہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی فن اپنی انتہا کو بھی چھوتا ہے۔ کوئی ابتداء رکھتا ہے اور کوئی اسکا درمیان ہوتا ہے اور پھر انتہا رکھتا ہے۔ سیاست کو اگر پیشہ ورانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایک ایسا شخص جو بڑی Lower سطح پر ایک ایسی Communication کا قائل ہو، کچھ لوگ اپنی ذات کے اندر گھرے رہتے ہیں اور اپنے مسائل کو اپنی ذات سے باہر نہیں آنے دیتے ہیں یا پھر بے توجہی سے ان میں سماجی شعور کم ہوتا ہے۔ بقول سقراط انسان جانور سے جدا اس لئے ہوا کہ وہ ایک سوشل Animal ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی آگے بڑھ کر گلی کوچے اور محلے میں اس ابلاغ کا قائل ہو کہ دوسروں کے ساتھ گفتگو کرے اور ان کی فلاح و بہبود کیلئے سوچے تو ہم اسے سیاس کہتے ہیں۔ جو سمجھ داری سے مشورہ بھی دے اور دوسروں کے مسائل حل کرنے میں ان کا ساتھ بھی دے۔ بعض اوقات سیاست کی ابتدا، اس خاموش طبع انسان کے احساس کمتری سے ہوتی ہے جو اپنے اندر سے کسی ذات کو اجاگر کرنا چاہتا ہے اور اس کو اپنی گفتگو کیلئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ بڑی کوشش سے پبلک کی فیلڈ میں آتا ہے اور اپنے ڈائیلاگ، Speech، خیال اور اپنے کاموں سے قائل کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی سپیشل اہمیت کا حامل ہے۔ میں ایسا شخص نہیں ہوں جو کسی Seclusion کا شکار ہے۔ بلکہ میرے اندر یہ صلاحیتیں موجود ہیں کہ میں اپنی ذات سے باہر بھی کوئی ہنگامہ خیزی پیدا کر سکتا ہوں جیسے وہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا۔

عاقبت منزل ماداریٔ خاموشاں است
حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

تو سیاست کی ابتدا غالباً اس اپج کی نتیجے میں ہے کہ جو انسان کے سینے کے اندر اپنے احساس کمتری سے گریز کرتے ہوئے اپنی ذات کی اہمیت کو منواتے ہوئے لوگوں کی خدمت کے تاثر میں وہ اپنے آپ کو Establish کرتا ہے اور جو عزت اسے لوگوں سے ملتی ہے وہ اس احساس کمتری کو Balance کرتا ہے۔ مگر یہ ابتداء ہے بلکہ ہمارے ملک میں سیاست کی ابتدا کچھ اس طرح سے ہے کہ لوگوں نے حکومتی اور سلطنت کے عہدداروں کے مناصب سنبھالتے ہوئے اپنے بچوں تک وہی اہمیتیں پہنچانا چاہتے ہیں اور ان کے پاس وقت ہوتا ہے سہولتیں ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کے مسائل سے اتنا نہیں نمٹ سکتے۔ جتنا ایک عام آدمی گلی کوچے میں Suffer کر رہا ہوتا ہے۔ تو میرے ملک میں دراصل سیاست مجھے شیر شاہ کا منصب داری سسٹم لگتا ہے۔ جس میں ہر منصب دار اپنے بیٹے کو اسی طرح کا ایک منصب دار سمجھنا چاہتا ہے اور جہاں پنج ہزاری، دس ہزاری اور ہفت ہزاری کے مناصب موجود ہیں۔ کوئی Provincial اسمبلی میں Establish ہوتا اور کوئی National اسمبلی میں Establish ہوتا ہے دراصل اس میں لوگوں کا کوئی تاثر شامل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی علاقائی اور اپنی زمینی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو اپنے ہی جیسے کسی دوسرے منصبدار سے مسابقت کے لیے وہ اپنے آپ کو اس اہمیت کا قائل کرنا چاہتا

ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ہماری سیاست کا 70% یا 60% ان مزارعین پہ مبنی ہے جن کے پاس شاید انکار کی گنجائش نہیں ہوتی ہے کہیں کہیں لوگ سرکشی کر جاتے ہیں ایک بڑے انقلاب کی خوشی کیلئے روٹی کپڑا اور مکان کیلئے جیسے ایک دفعہ لوگوں نے ان چھوٹے منصب داروں کی توہین بھی کی۔ ان کو Insult بھی کیا اور باغیانہ روش اختیار کر کے نئی امید اور توقع کے ساتھ سیاست میں انہوں نے ایک فیصلہ کن جدوجہد کی اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے لوگوں کو آگے لائے مگر تھوڑے عرصے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ صاحب بھی زمیندار ہی تھے اور انہوں نے بھی تو انہیں کوئی ایسا Benefit نہیں دیا۔ جسکی وہ پابندی کرتے اور اس مایوسی میں وہ زیادہ منصب داری سسٹم میں الجھ گئے۔ سیاست کی منصب داری میں زیادہ الجھ گئے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بھٹو کے زمانے میں جو Public opinion انقلاب میں آیا تھا اگر وہ جاری رہتا تو آج نہ کسی جنرل کی گنجائش رہتی اور نہ کسی Change کی مگر خود بھٹو صاحب کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلطی کر بیٹھے ہیں کہاں ان گرے پڑے لوگوں کو شعور ذات، شعور ملک اور شعور اہمیت دے گئے اور جو احساس کمتری ایک زمیندار کے دل میں تھا اور جس کی خاطر وہ جدوجہد کرتا تھا اب ہاری کے دل میں چلا گیا۔ مزارع کے دل میں چلا گیا اور اس نے دو بار کوشش کی۔ پہلی دفعہ قائداعظم اور دوسری دفعہ بھٹو کے ساتھ کی۔ ان کی پہلی قائداعظم والی کوشش اللہ کے فضل سے کامیاب رہی ہے اور اللہ نے ملک دلوا دیا مگر ان کی دوسری کوشش بری طرح ناکام رہی جسکے نتیجے میں مایوسی ہوئی اور اس سے پورا سسٹم الٹ گیا۔ یہ Set Back بڑا Serious ہوتا ہے۔

شاہ صاحب! اگر آپ غور کریں تو یہ عام آدمی کیلئے بڑا مشکل ہوتا ہے کسی انقلاب آفرین مہم میں حصہ لینا بڑا مشکل ہے کہ وہ اپنا سب کچھ ترک کر کے، اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا کر، اپنے پرانے تعلقات داؤ پہ لگا کے اور اپنی پرانی زندگیوں کے Pattern داؤ پہ لگا کر جب ایک دفعہ انقلاب کیلئے نکلتا ہے تو اس کا نتیجہ انقلاب فرانس ہوتا ہے یا انقلاب روس ہوتا ہے اور اسی قسم کی توقع ہمارے لوگوں نے ذوالفقار علی بھٹو سے لگائی تھی مگر بدقسمتی سے وہ پوری نہ ہوئی اور ہمارے لوگ اس لحاظ سے بڑے بدقسمت ہیں کہ ان کی وہ کوشش جو انہوں نے اپنے حقوق، زندگی اور وراثت عقل اور انقلاب لانے کے لئے کی تھی وہ بری طرح ناکام ہو گئی نتیجتاً ہم دیکھتے ہیں کہ زمینداریاں اور پختہ ہو گئیں۔ سیاست دانوں کے طنطنے اور بڑھ گئے۔ بلکہ اب تو میرا خیال ہے کہ اس سیاست میں تیسری نسل ان ہی خاندانوں کی ہے اور ان میں اب ہمیں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا ہے ایک بوسیدگی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ Education کا ماحول ڈگریوں سے نہیں بنتا۔ صدر پرویز مشرف کی ایک نہایت شیر خوارانہ کوشش تھی کہ Gradute اسمبلی ایک بہت بڑا فرق لائے گی۔ مگر وہ خود اس شیر خوار اسمبلی کے قاتل نکلے ہیں۔ اس لیے کہ جس اسمبلی کو انہوں نے پڑھی لکھی اسمبلی قرار دیا ہے اس کے ارکان کو خود ہی غلامی کے انداز سکھا رہے ہیں اور ان کو سمجھا رہے ہیں کہ باوجود تمہاری ڈگریوں اور تمہاری صلاحیتوں کے تمہیں کرنا وہی ہے جو ایک فرد واحد کہے گا۔ بلکہ حیران کن بات ہے کہ ان پڑھ اسمبلی کے سیاست دانوں میں سے کوئی دو چار صاحب کردار نکل آتے تھے لیکن اس پڑھی لکھی گریجویٹ اسمبلی سے ایک صاحب کردار ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ سوائے ان چند لوگوں کے جنہیں انکی انا اور سیاست کی پاکیزہ وابستگی گرنے پڑنے سے روک رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ جو بندہ سیاست سے مایوس ہوتا جاتا ہے آخر کار وہ بھی انکا ساتھ دینا شروع کر دیتا ہے۔ کردار کی یہ Shift اس طرح سمجھ نہیں آتی۔ فرض کریں کہ پاکستانی سیاست میں صرف ایک ہی قانون ہوتا۔ کہ پارٹی Change کرنے والے کی سزا تین برس ہوتی۔ یہ ہوتا کہ آپ پارٹی Change کر سکتے ہو مگر پہلے اپنی Constituency سے استعفٰے دینا ہوگا اور جس پارٹی کے نام اور حوالے سے تم جیتے ہو اس پارٹی سے استعفا دو اور دوبارہ دوسری پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے اپنے حلقے کے لوگوں کے پاس جاؤ لیکن کبھی ایسا بھی اس ملک میں نہیں ہوا۔ مگر سب سے بڑی بات جو سیاست کی ہے، وہ سیاسی مدبر اور صاحب تدبیر کا پیدا ہونا ہے۔ ایک سیاسی شخصیت جو آخر کار سیاست ولایت پر ختم ہوتی ہے۔ جیسے ہر چیز اپنی انتہا کو پہنچ کر نفیس تر اور اعلیٰ ماہرانہ نفاست بن جاتی ہے۔ اس طرح آپ سیاست کے پس منظر دیکھیں کہ اس کے دوران سے گذرتے ہوئے بہت اعلیٰ ترین کسی مدبر سے واسطہ پڑتا ہے۔ قائداعظم کے بعد سرزمین پاکستان کو ایسا کوئی مدبر نہیں ملا۔ بلکہ ہماری سیاست میں جو سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارے خود حکمرانوں نے ہی اپنے عوام میں بزدلی اور حمیت کے اسباب پیدا کئے نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمیں یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ کہ کوئی سیاستدان ہمیں یہ نہیں بتا رہا ہے کہ ہماری کوئی Commitment اس ملت اور ملک کے ساتھ موجود ہے۔ جس تیزی کے ساتھ ہم اپنے آپ کو حکمرانوں کی مرضی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ کل کوئی حکمران ہمارا ملک ٹھیکے پر تاج برطانیہ کو دے دیتا ہے تو میرا نہیں خیال کہ لوگ کوئی زیادہ Resist کریں۔ لگتا یہی ہے کہ ہم رفتہ رفتہ صرف اپنے حکمران کی عبادت کے عادی ہو رہے ہیں۔ ہمیں کہیں اللہ کی عبادت کا عنصر نظر نہیں آتا ہے۔ اقتدار ایک ایسی خوفناک حقیقت بن چکا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بحیثیت قوم اور ملت بھی امت مسلمہ ایک شدید ترین احساس کمتری کے دور سے گذر رہی ہے۔

سید نسیم تقی جعفری ایڈیٹر "ادراک" پروفیسر احمد رفیق اختر کا انٹرویو لے رہے ہیں۔ محمد آصف ملک ایگزیکٹو ایڈیٹر بھی موجود ہیں

ادراک: سر آپ نے پاکستانی سیاست میں بھٹو صاحب کا حوالہ دیا ہے اور آپ نے فرمایا ہے کہ وہ بھی اجتماعی طور پر کوئی زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے اور وہ بھی ناکام ہو گئے ہیں لیکن عام طور پر یہ تاثر ہے اور یہ بات ریکارڈ پر بھی ہے کہ معاشرے کے Down Trodden اور غریب طبقات Feudalism نے جن کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ بھٹو صاحب نے ایک شعور دیا اور ان کے اندر ایک ووٹ کا تصور دیا۔ اس کے حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب! انہوں نے شعور دیا اور فوراً واپس بھی لے لیا اور اگر غور کریں تو میرا خیال یہ ہے کہ پاکستان میں جو بیداری خواہ وہ ناقص ہی تھی۔ سوشلسٹ تھی نان سوشلسٹ تھی ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں مگر جس تیزی سے لوگ سیاسی شعور کو بڑھے تھے اور جس تیزی سے انہوں نے امرا، اور زمینداروں کے گریبان میں ہاتھ ڈالے تھے۔ بہت جلد ان کے ہاتھ واپس اپنی پوزیشن پر آ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس تبدیلی اور انقلاب کو Maintain نہیں رکھ سکے۔ اس کی وجہ شاید حکمرانوں کا یہ اندازہ تھا کہ وہ بھی ماشاءاللہ ایک بڑے زمیندار تھے اور انہوں نے بہت جلد Realize کر لیا کہ اس قسم کی عوام کو دی ہوئی آزادی ہمارے اپنے لئے زہرناک ثابت ہوگی اور انہوں نے بھی اگلے الیکشن کو اسی بنیاد پر لڑا جو Typical زمینداری سسٹم ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ بھٹو

صاحب کے پہلے اور دوسرے الیکشن کا موازنہ کریں تو آپ کو بہت کم وہ نام نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے پہلے الیکشن میں ایک غریب مزدور کی حیثیت سے حصہ لیا تھا اور مشہور تھا کہ اگر وہ کھمبے کو بھی کہتے تو لوگ اسے ووٹ دیتے مگر انہوں نے چانس نہیں لیا۔ اگلی مرتبہ یہ Risk نہیں لیا اور وہی رئیس، زمیندار اور قریشی واپس آئے۔ وہی کھر آئے وہی جتوئی آئے۔ ملک وہیں پہنچ گیا جہاں پہلے تھا مگر اس کا ایک غلط نتیجہ نکلا اور غلط نتیجہ یہ تھا کہ جو توقعات لوگوں نے اس Change سے لگائی تھیں، جو امیدیں اس سے وابستہ کی تھیں اور جو روٹی کپڑا اور مکان کا تصور انہوں نے پالا تھا وہ بھی پورا نہ ہوا اور اب بڑی مشکل ہے کہ لوگ پھر کسی لیڈر کی صداقت پر کبھی اعتبار کر سکیں۔

ادراک: سر اگر ہم تحریک پاکستان پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں زیادہ تر سیاست دان، دانش ور، شاعر، صحافی اور عالم دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن لمحہ موجود میں ہمارے سیاست دانوں کی ایسی حیثیت پہچان اور شناخت نہیں ہے آپ کے نزدیک اس کے کیا اسباب ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب! Comparisons اور Contradictions میں دماغ اپنی حیثیت پہنچانتا ہے اگر Questions نہ ہوں Conflicts نہ ہوں Comparisons نہ ہوں اور متصادم نظریات نہ ہوں تو Brain ایک ایسی Dullness میں چلا جاتا ہے جسے صرف سہولت چاہیے ہوتی ہے۔ علم بہر حال تکلیف اور حلم ہے آسانیوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اگر آپ اس وقت کو دیکھیں جب ہمارا مقابلہ ایک بڑی قوم سے تھا جس کے ساتھ ہم ایک ہزار سال جی سکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم مسلمان غربت و افلاس میں گر چکے تھے اس پہ سر سید کی رپورٹ آپ کے سامنے ہی ہے۔ جو اس نے اس وقت کے مسلمانوں پہ لکھی۔ توہین مراتب کا یہ حال تھا کہ مسلمان سرداروں کے لباس ہوٹل کے ملازموں کو پہنائے جا رہے تھے۔ تا کہ ان کی اناء اور حمیت کچل دی جائے۔ برطانیہ نے اس کے لئے ہر قسم کا نفسیاتی حربہ بھی استعمال کیا تھا۔ اس کے باوجود مسلمان اپنی پرانی جنگجویانہ خصلتیں نہیں بھولے تھے اور انہوں نے ہر ممکنہ کوشش کی چاہے وہ علی گڑھ یا کسی مشنری سکول سے پڑھے ہوں۔ انہوں نے اس چیلنج کو Face کیا الحمدللہ انہیں اس وقت انتہائی Committed انتہائی Honest اور انتہائی Clear-Headed لیڈر مل گیا جو شاید دنیا بھر میں اس وقت ایسی کوئی شخصیت موجود نہ تھی۔ بلکہ نہرو اور قائداعظم کا جب مقابلہ کیا جائے تو نہرو ایک خوشامد پسند انسان تھا کہ جس نے کاسہ لیسی سے اتنی بڑی حکومت لی ہے لیکن قائداعظم نے ایسی حکومت لڑ کر حاصل کی تھی اور لارڈ Ackenlack غلط نہیں کہتا تھا کہ By God he is a very proud man یعنی قائداعظم کے بارے اس کے حریف بھی اس کے معترف تھے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جس کی کمٹمنٹ کسی حال میں بھی ہم توڑ نہیں سکتے یا کسی قیمت پر بھی یہ اپنی قوم کا سر نیچا نہیں ہونے دے گا۔ یہ بڑا عجیب سا تصور ہے کہ عموماً دیکھا یہ جاتا ہے کہ قوم لیڈر کو طاقت دیتی ہے مگر ہمارے ہاں یہ واقعہ ہوا کہ لیڈر قوم کو طاقت دے گیا۔ آپ اگر شعوری طور پر دیکھیں تو لیڈر وہی ہوتا ہے۔ ایک سادہ سا انسان جب عوام میں پہنچتا ہے اور نعرے سنتا ہے تو ایک دم بڑا لیڈر بن جاتا ہے مگر قائداعظم میں ہم اس قسم کا کوئی جذبہ نہیں دیکھتے۔ اس کی Commitment اور اس کے Purpose کی Accountability لوگوں سے نہیں تھی مگر اس کی اپنے اللہ کے

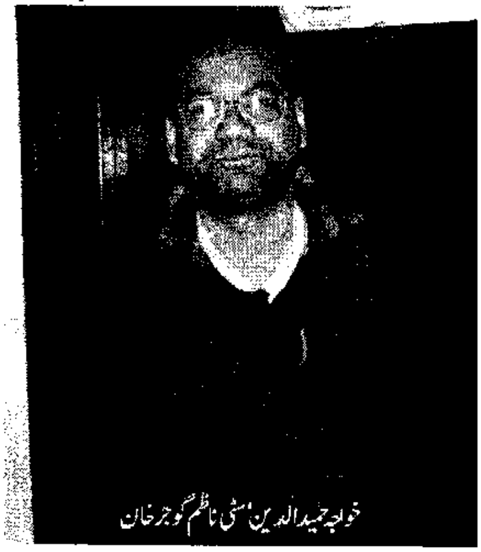

خواجہ حمید الدین سٹی ناظم گوجرخان

ساتھ تھی۔ وہ ایک ایسا مسلمان تھا جو بار بار Dictates کر رہا تھا کہ جو مجھے امانت عقل و علم اور جو اخلاقی ذمہ داری سونپی گئی ہے میں اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس کے اپنے لفظوں میں کہ When i wil go to God, He will say well done Jinnah اس طرح کی Commitment کا عشر عشیر بھی ہمیں بعد میں نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہمارے آج کے لیڈروں کی Commitment کا یہ حال ہے کہ ہمارے ہاں صدر سے لیکر چپڑاسی تک کا کچھ پتا نہیں لگتا کہ وہ کس چیز کے ساتھ Committed ہیں۔ برطانیہ کے ساتھ یا امریکہ کے ساتھ۔ بہر حال ایک بات وضاحت سے نظر آتی ہے کہ ان کی ملکی Commitment صرف اتنی ہے کہ غلامی ہو چاہے آزادی ان کی اپنے اختیارات سے Commitment واضح نظر آتی ہے اور پھر ہر لیڈر اتنا Dishonest ہے کہ اپنی کسی غلط بیانی کیلئے ہزار دلائل ڈھونڈ لیتا ہے اور ایسے ایسے بھیانک اعتراضات وضع کرتا ہے کہ پتا لگتا ہے کہ موصوف نے جتنے بھی چوہے کھائے ہیں۔ وہ حج کیلئے نہیں بلکہ اقتدار کیلئے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ قوم اور پاکستان کے کھاتے میں پڑتا ہے۔ یہ سارے جھوٹ رسہ کشی اور مکروفریب، اقتدار کے حصول کے لئے ہیں مگر لیڈروں کی زبان سے نکلتا ہے کہ ہم نے سب کچھ پاکستان اور پاکستان کے عوام کیلئے کیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم بڑے Dreamer ہیں۔ پاکستان کے سادہ لوح عوام ہمیشہ ایک Hero کے تصور میں رہتے ہیں۔ ایک طرف یہ بے نظیر کی صورت میں کسی فلم کی اس ہیروئن کا عکس دیکھتے ہیں جو بالآخر ایک شہزادی کی صورت میں آسمان سے اتر کر ان کو نجات دلوائے گی۔ اور کچھ نواز شریف سے توقعات رکھتے ہیں کہ یہ گورا چٹا انسان جو وعدے اور دعوے کر رہا ہے ضرور پورے کرے گا اور ہم پھر جنت کے خواب میں چلے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر پوری پاکستانی قوم کو ان جھوٹے اور دغاباز لوگوں نے خوابوں کی دنیا کا مسافر بنا دیا ہے۔

ادراک: سر کچھ سیاسی لوگ یہ کہتے ہیں کہ سیاست ان کے نزدیک ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ کیا واقعی سیاست عبادت ہو سکتی ہے اور یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں اس میں کس حد تک صداقت اور حقیقت کا عنصر شامل ہوتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ لیڈر سیاست کو عبادت ہی سمجھتا ہے مگر آخر عبادت سے بھی تو کوئی صلہ مانگتا ہے نا یعنی وزیر بننا، اور صدر کا مشیر بننا، یا اس کے قریب ہونا اور پارٹی کا چیئرمین بن کر فنڈ زغبن کرنا اور لوگوں کو طرح طرح سے جھوٹ بول کر دھوکا دینا واقعی سیاست عبادت ہو چکی ہے۔ مگر یہ عبادت شیطان کی ہے۔

ادراک: سر آپ بھی سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں اور آپ نے گوجرخان میں کسی حد تک سیاست میں اپنا کردار بھی ادا کیا ہے کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ آپ نے سیاست میں عملی طور پر حصہ لے کر کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔ اس حوالے سے آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میں جب اپنے اخلاقی سبق سیکھ رہا تھا تو میں نے آخری سبق یہ سیکھا تھا کہ عوامی رائے ایک مافیا ہے اور جو شخص Public opinion کا قیدی ہے وہ کبھی نارمل انسان ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ میں 1980ء میں اس شہر میں آیا۔ میں ایک وضاحت کر دوں کہ میں جب بچپن میں یہاں پرائمری میں پڑھا کرتا تھا اور جس سکول میں جایا کرتا تھا اس میں اتنی گرد اڑتی تھی کہ مائیں آ کر تلاش کرتی تھیں کہ ان کا بچہ کون سا ہے اور جب ہم سکول سے واپسی پر آئینہ دیکھتے تھے تو ہم اس شخص کو تلاش کرتے تھے جس کا نام میرے جیسا تھا۔ اس غلاظت کو 70 سال گذر گئے۔ میں جب 1980ء میں واپس آیا تو میں نے اس سکول کو اسی حالت میں دیکھا۔ ان بچوں کو اسی حال میں دیکھا۔ ہم ایٹمی طاقت ہو گئے تھے مگر سکول اسی

طرح تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ایک افسوس اور ایک درد سا جو میرے سینے میں اٹھتا تھا کہ کوئی شخص کیوں کچھ نہیں کر سکتا؟ ذرا اصلاح کا رہو جائے تو شاہ صاحب! لوگوں کے لئے تو نہیں مگر میں نے اس بچپن کے اس احساس کیلئے جب ہم مٹی میں کھیلتے تھے مٹی میں بیٹھتے تھے اور مٹی پڑھتے تھے مٹی موگھتے تھے اس خیال سے میں نے سکول میں اینٹیں لگوانی شروع کیں جس سے کم از کم میرے دل کو تو تسلی ہو کہ یہ بچے پہچانے جائیں کہ کون کس کی اولاد ہے۔ اب اس چیز کو عوام مختلف انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔ غالباً بہت ساری Opinion یہ کہے گی کہ یہ ذاتی Show off تھا بہت ساری Opinion یہ کہے گی کہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا مقصد کیلئے ہے۔ لیکن But i am telling you, this is what my intention, simply to have a little improvement in the condition. اس وقت سیاست تھی ہی نہیں۔ جب واپس آیا تو میں سکول میں گیا اور میں نے بچوں کو مٹی میں دیکھا تو میں نے ٹیچر سے پوچھا کہ میں ان کیلئے کچھ ذرا بہتری کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کچھ اچھے ٹاٹ منگوا دیں۔ میں نے دوستوں سے درخواست کی اور اِدھر اُدھر سے تو اس زمانے میں پچیس، تیس ہزار روپے کے ان کو ٹاٹ لے کر دیئے اور پھر اس سے آگے بڑھ کے سکول میں اینٹیں لگوا دیں۔ یہ میرا اپنا سکول تھا۔ میں نے اتنا بڑا اس پہ کرم نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنی ذات اور لوگوں کیلئے کیا تھا۔ It had happend and I had to do it so. تو اس شہر میں تمام جماعتوں کے سرکردہ لوگ سیاست میں رہے ہیں۔ جماعت اسلامی اقتدار میں آئی، چوہدری ریاض صاحب کے تو دن ہی نہیں گنے جا سکتے، اتنے طویل تھے اور وہ بڑی انتظار کی صبر آزما گھڑیاں تھیں جن میں یہ رخصت ہوئے تھے۔ پیپلز پارٹی کے لوگ بھی آئے۔ سب لوگ آئے۔ ان میں متعدد بڑے اچھے لوگ آئے تھے اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ They are very appreciated and they are very good working agents مگر میں نے بدقسمتی یہ دیکھی کہ یہ شہر پچاس، ساٹھ اور ستر سال اسی حال میں رہا۔ ان گلیوں میں میرے دادا کے زمانے کی اینٹیں لگی تھیں۔ اب تو اس قابل نہیں تھیں اب ان میں جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ کئی دفعہ میں تحصیل روڈ سے گزرتا تھا تو مجھے اپنے منتخب لیڈروں پر بہت غصہ آتا تھا اور میں ذاتی طور پر ان کے پاس جاتا تھا کہ خدا کیلئے یار ایک آدھ سڑک تو اس قابل کر دو کہ جس پر سے لوگ اطمینان سے گزر سکیں۔ تو وہ کہتے پروفیسر صاحب آپ کو پتا نہیں ہم کتنی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس باریوں کر دیں گے اور توں کر دیں گے۔ And i had full confidence in my understanding that it will never happened تو شاہ صاحب! ان دنوں میرے ایک بہت اچھے دوست اور میرے اچھے شاگرد اللہ کی رحمت کا فرشتہ بن کر اس شہر میں آئے And even then, i had not started the politic. آپ کو یہ یاد ہونا چاہیے کہ اس وقت تک بھی میں نے سیاست شروع نہیں کی تھی۔ جب وہ شخص آیا تو میرے اندر ایک امید جاگ اٹھی کہ اب میں اس شہر، لوگوں، اور دیہاتوں کیلئے کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے اس سے بات کی۔ وہ ایک بہت ہی فعال شخص تھا۔ اس میں کام کی اہلیت اور سعادت اتنی زیادہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے اس کھنڈر کو اس نے ایک واقعی شہر میں بدل دیا۔ آپ بتایئے سارے کام تو پورے نہیں ہوتے نا۔ اب مجھے فکر تھی کہ یہ گورنمنٹ کا ایک آفیسر ہے۔ آج کل چلا جائے گا اور اس اللہ کے بندے نے جس کرم گستری سے دن اور رات ایک کر کے اس شہر کو ایک خوبصورت شہر بنا دیا تھا اس کے جانے کے بعد حالات بدتر ہو جائیں گے۔ لہذا میں نے اپنے لئے ایک یونٹ چنا تا کہ کسی طریقے سے وہ کام جاری رکھ سکیں۔ میرا اس کے سوا سیاست میں آنے کا بالکل کوئی مقصد نہیں تھا کہ جو فلاح و بہبود کے کام ہم نے شروع کیے ہیں وہ جاری رہ سکیں۔ لوگ تو کہتے تھے کہ آپ ماشاءاللہ فلاسفر، دانشور اور صوفی ہیں آپ کو یہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی تو شاہ صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ وہ فلاسفر، دانشور اور صوفی تو اہل کوفہ سے بھی بدتر ہوا نا جو بیٹھ کر سب کچھ دیکھتا رہے جو اس کے اردگرد غلاظت کے انبار ہیں اور وہ پھر یہ سوچتا رہے کہ وہ بڑا عظیم فرد ہے اور لوگ بڑے بدتر ہیں۔ کیا وہ اس چیز کو انجائے کرے گا یا اگر اس میں اہلیت ہے یا اختیارات کی پوزیشن اس میں موجود ہے تو پھر وہ اس کو کام میں نہ لائے۔ مجھے دنیا کی کوئی کتاب بتا دیں کہ جس میں کسی ایسے شخص کو قابل قدر شخص سمجھا گیا ہو۔ کہ جس میں اہلیت تھوڑا سا اخلاق ہو، اور لوگوں کا تھوڑا سا درد موجود ہو اور پھر وہ اپنی دہلیز سے ایک قدم آگے بڑھ کر کوئی کام نہ کرے۔ شاہ صاحب! میرے لیے یہ بات سیاست کی طرف آنے کا سبب بنی ہے اور اس کا پہلا قدم یہ نیت تھی اور دوسرا قدم ایک ایسا شخص منتخب کرنا تھا جو مقدس نہ ہو۔ یعنی میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی ایسا شخص موجود ہے جو ایمانداری سے، اس لٹیرے پن کی سیاست سے نکل کر کیا واقعی لوگوں کے کام کر سکتا ہے؟ تو پھر میری نظر خواجہ حمید الدین پر پڑی اور میں نے بھی ایک کام کرنا تھا۔ میں نے صدقات کا ایک نظام وضع کرنا تھا۔ Initiate کرنا تھا۔ اس کی Efficiency دیکھنی تھی ایک Religion Instituation کو Establish کرنا تھا۔ اس لئے مجھے تھوڑی سی سیاسی جگہ چاہیے تھی۔ جو میں نے خواجہ حمید الدین کے ذریعے شروع کی۔ اور الحمد اللہ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے اسے بے تحاشا پسند کیا ہے اور اسے پوری کوشش سے Return کیا ہے۔ اور اس کی مخالفت ہر پارٹی نے کی۔ ہر اس شخص نے کی جو منصب داری سسٹم کے تحت اپنے لیے عزت چاہ رہا تھا یہ سب رسوا ہوئے اس لیے کہ ان کی نیات اور اس کی نیت میں بہت زیادہ فرق تھا ہو سکتا ہے کہ اس میں بہت ساری اخلاقی برائیاں ہوں مگر کسی شخص نے اس سے یہ گلہ نہیں کیا کہ اس نے پبلک فنڈز میں خورد برد کیا ہے۔ گلیاں بنیں، کنوئیں بنے، گھر گھر میں بجلی پہنچی۔ یہ ایک گرے پڑے اور پسماندہ علاقے میں اس نے اتنا زیادہ کام کیا ہے کہ گورنمنٹ اپنے وزیروں کے علاقوں میں بھی اتنے کام نہیں کروا سکی۔ ابھی کام باقی تھا سو وہ پھر سیاست کے لئے نکلے ہیں اور پھر ماشاءاللہ لوگوں نے ان کو Return کیا ہے اس میں میرا سسٹم چل رہا ہے۔ میں اس کے اختیارات استعمال نہیں کرتا میں قطعاً جا کر اس کے فیصلوں میں مداخلت نہیں کرتا اور لوگوں کے جا کر فیصلے نہیں کرتے میں بالکل ایک طرف ہوں He is doing his fuction آپ صرف یہ کہہ سکتے ہو کہ میں سیاست میں اپنے نظریات کے عملی فروغ کی حد تک ہی Invovle ہوں۔

ادراک: سر آپ نے نہایت خوبصورتی سے، مدلل اور جامع انداز میں سیاست میں اپنے کردار پر روشنی ڈالی ہے لیکن دوسری طرف کچھ لوگ ایسے بھی سوچتے ہیں کہ تمام سیاسی جماعتوں کے معتبر افراد کے نزدیک آپ کی شخصیت بہت محترم ہے لیکن جب آپ الیکشن میں کسی ایک گروپ یا جماعت کو سپورٹ کرتے ہیں تو آپ کی شخصیت دوسرے سیاسی گروپس یا جماعتوں کے درمیان متنازع ہو جاتی ہے اگر یہ درست ہے تو پھر آپ سیاست یا الیکشن میں حصہ کیوں لیتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: Well، آپ مجھے کوئی ایسا شخص بتائیں جسے سبھی لوگ اچھا سمجھیں؟ میرا خیال ہے ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ ہاں میں آپ کو سب سے ضروری بات بتا رہا ہوں جس کی میرے دل میں کوئی اہمیت نہیں وہ Public Opinion ہے اور میں عوامی رائے کی روشنی میں اپنا مذہب، انداز فکر اور اپنی Situations نہیں بدل سکتا۔ فرض کرو کہ میں الیکشن کیلئے نکلا ہوں تو میں نے کہیں دشنام طرازی اختیار نہیں کی ہے۔ بلکہ پورے الیکشن میں میں نے اپنے ان ساتھیوں کی بات نہیں کی جن کی تعلیم واجبی تھی مگر میرے نام کے ساتھ کسی پارٹی کی کوئی ایسی مخالفت منسوب نہیں ہے کہ میں نے کسی کے ذاتی نقائص بیان کئے ہوں البتہ میں نے لوگوں کے سامنے یہ بات رکھی ہے کہ اگر اس شخص کی کارکردگی اچھی ہے تو اس کو Return کرو ورنہ آپ یقین جانیں میرے دل سے ایک آواز اٹھتی ہے کہ لوگ میرے Candidate کو Return نہ کریں اور کوئی اس سے بہتر

ڈھونڈ لیں اور میں سیاست سے فارغ ہو جاؤں۔ باقی رہی بڑی پارٹیوں کی بات تو یہ عرض ہے کہ جیسے باقی لوگوں کی Wishes ہوتی ہیں، میں بھی ایک بہت بڑے معاشرہ کا فرد ہوں اور میری بھی حضور کی حدیث کے مطابق یہ خواہش ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ لوگ انگلی اٹھا کے کہیں گے کہ وہ فلاں جگہ ایک شہر ہے اور اس میں ایک علاقہ اور ایک گلی ہے اور اس میں ایک مکان ہے اور اس میں ایک ایماندار آدمی رہتا ہے اور میرے ارد گرد صورت حال ایسی ہی ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ یا رسول اللہ اس علاقے میں دو ہی ایماندار آدمی رہتے ہیں اس کے علاوہ تو میری ذاتی کوئی خواہش نہیں ہے۔

ادراک: سر کیا معاشرہ کے ہر طبقہ فکر اور فرد کیلئے سیاست میں عملی طور پر شریک ہونا ضروری ہے اور اگر نہیں تو آپ کیا کہتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ایک تو ضروری ہوتا ہے اور ایک سیاسی شعور ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ کو پتا نہیں ہے کہ آپ کس کو ووٹ دے رہے ہیں؟ کسے چن رہے ہیں؟ کس مقصد کے لئے چن رہے ہیں؟ سیاست کی تربیت داخلی بھی ہوتی ہے اور خارجی بھی ہوتی ہے۔ داخلی کیفیت یہ ہوتی ہے جس میں آپ Personal واقعات میں سیاسی لوگوں کے خلاف جاتے ہیں اور ان کے حق میں جاتے ہیں اور ہمارے ملک میں ایک بہت بڑی Power ہے جسے افواہ سازی کہتے ہیں کہ ہم بہت ساری Personal باتیں بغیر کسی Perception کے قبول کر لیتے ہیں اور بہت ساری ایسی باتیں جو شاید آپ کے بدترین سیاسی حریف کے حوالے سے نہ ہوں مگر ہم ان کو فوراً قبول کر لیتے ہیں اور جب تک آپ تھوڑے بہت تعلیم یافتہ نہ ہوں گے اور تعلیم یافتہ کا مطلب ڈگریاں ہرگز نہیں ہیں بلکہ جب آپ اپنے سیاسی شعور میں تھوڑے سے پختہ نہ ہونگے آپ دوسروں کو ووٹ کے لئے کیا گائیڈ کریں گے۔ آپ خود بھی اپنا ووٹ ہمیشہ غلط ڈالیں گے۔ اور مدتوں سے پاکستان میں یہی ہو رہا ہے۔

ادراک: ہمارے معاشرے میں بعض حلقوں کی یہ رائے ہے کہ سیاست ایک ایسا فیلڈ ہے جس میں پڑھے لکھے اور دانشور قسم کے لوگوں کو نہیں آنا چاہیے۔ کیا یہ بات جناب علمی طور پر درست ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میرا تو یہ خیال ہے کہ چونکہ لوگوں نے مدتوں سے کسی پڑھے لکھے آدمی کو نہیں دیکھا اور مدتوں سے ان کے سامنے ایسی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ اسی لئے تو P.M. اور President کے عہدہ کے لئے منتخب اور مسلط لوگ اچھی اردو بھی نہیں بول سکتے تھے اور بعض اوقات ان کی تقریریں سن کر یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہ لوگ اس قابل بھی ہیں کہ ان کو ووٹ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کا لہجہ ہی سنوار دے اور ان کا اخلاق سنوار دے یا ان کی گفتگو سنوار دے۔ قومی زبان کے ہوتے ہوئے اس میں بہت کم سیاست دانوں کو اچھی گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے اور بلکہ ایک Patent انداز بنا ہوا ہے۔ ہاتھ کھڑے کرنا انگلیاں لٹکانا جو شاید پرانے زمانے کے برہمن تو نہیں ایسے چنڈال قسم کے لوگ کیا کرتے تھے۔ تو یہ تو مجھے چنڈالوں کی سیاست نظر آتی ہے۔ ناچ کود کر کے ایک ڈرامائی انداز میں لوگوں کو Influence کرتے، پھر میں سوچتا ہوں کہ لوگ کس انداز کی پیروی کرتے ہوں گے۔ اس لئے کہ ان کے سامنے کسی بہتر سیاست کی مثال نہیں آتی۔ اس کی مثال ایک موجود ہے کہ قائداعظم کی انگریزی کسی کو سمجھ نہیں آتی تھی اور انکی اردو کا انداز بھی ماہرانہ نہیں تھا۔ مگر اس میں ایک ایسی چیز تھی جو لوگوں کے دلوں میں سیدھی

جا اترتی تھی۔ وہ اس کا اخلاص، دیانت، امانت اور اس کی Commitment تھی۔ پھر دیکھیں اگر آپ کی Language شستہ نہ بھی ہو تو کم از کم جو بات آپ کر رہے ہوں اس میں کوئی تو وزن ہو مگر ہمارے ہاں سیاست میں تو یہ ساری چیزیں ناپید ہیں۔ اور خدا جانے کب وقت آئے گا۔ کہ میں آپ کو ایک Funney سی بات بتاؤں کہ میں جب اپنے لیکچر دے رہا ہوتا ہوں۔ اور بڑے مشکل لیکچر ہوتے ہیں مگر میں یہ دیکھتا ہوں کہ ایک ہزار آدمی میرے لیکچر میں بیٹھا ہوا ہے، بڑی توجہ سے سن رہا ہے اور چھ چھ گھنٹے آٹھ آٹھ گھنٹے سنتا ہے اور بڑے اخلاص سے سنتا ہے۔ تو میرا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لوگوں میں ایسی کوئی کمی نہیں ہے مگر انکو کسی بہتر چیز کی شناسائی نہیں ہوتی ہے۔ اگر لوگ میری Language سن سکتے ہیں تو اس وقت میرا خیال ہے کہ میں مشکل ترین Language بولتا ہوں اور لوگ جس توجہ سے سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں تو میرا خیال یہ ہے کہ ہماری سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ ایک تو ہمارے پاس زبان نہیں ہے، دوسرا خیال نہیں ہے اور تیسری کمٹمنٹ نہیں ہے۔

ادراک: سر کیا جمہوریت ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ اور اسلام کس حد تک جمہوریت کو قبول کرتا ہے اور کیا اسلام میں موجودہ جمہوری فلسفے کی گنجائش ہے۔؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: یہ جمہوریت مسلمان ملکوں ہی کے انداز اور اسلوب سے یورپ میں پہنچی ہے۔ کیونکہ یہاں اسلام کی روشنی میں ایک عام آدمی اور ایک جج کو ایک جیسی آزادی اور وقار حاصل تھا۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ جو تین سو برس سے قائم ہے، اس کے ایک آدمی نے بھی قرآن نہیں پڑھا ہوگا جو پندرہ سو برس پہلے زمین پر نازل ہوا ہے۔ اگر وہ زمین پر چلتی ہوئی چیونٹیوں کی تعداد اور آسمان کی پہنائیوں میں گھومتے ہوئے سیاروں سے متعلق معلومات رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ابھی تک قرآن نہ پڑھا ہو اور یہ کیسے ممکن ہے کہ M-16 کی فائلوں میں قرآن کی کاپی نہ ہو۔

یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے۔ کہ دو سو سال کی crusade war کے بعد ہی عیسائیوں میں اسلامی شعور کا عکس ابھرا ہے۔ یہ constantinople کے زوال کے بعد ہی کی داستان ہے۔ کہ ان کی dark-ages میں ہدایت اور علم کے فلسفے کا نور مسلمانوں ہی کی وجہ سے آیا ہے۔ اس طرح ان کی جمہوریت کے انداز اور رنگ میں بھی مسلمانوں کے اجتماعی اور انفرادی فکری جہان کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں اساسی فرق یہ ہے کہ کرہ ارض پر اسلام کے سوا کوئی اور نظام Morality Laws کا خالق نہیں ہے۔ آج تک کسی معاشرے میں Morality کے قوانین نہیں بنائے ہیں۔ اسلام Morality کے قوانین پر کسی قسم کی مصالحت اور سمجھوتہ نہیں کرتا ہے کیونکہ یہ خدا کے احکام ہیں اور ان کے تحت اللہ حاکمیت اعلیٰ کا مالک ہے۔ اسلام، ٹریفک، معیشیات اور جسٹس وغیرہ کے تمام قوانین وضع کرنے کی مکمل آزادی اور اختیار دیتا ہے۔ لیکن اسلام Homosexuality,Lesbianism اور Free Criminology کی اجازت نہیں دے سکتا ہے۔ یہ بڑا فرق اسلامی جمہوریت اور تمام غیر اسلامی جمہوریت کے فلسفے میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ میں جمہوری ملکوں کی جمہوریت میں بہت زیادہ تضاد دیکھ رہا ہوں۔ آج انہوں نے شادی کی جگہ Homosexuality کی اجازت دے دی ہے۔ اور شادی کو Partnership کا نام دیا جانے لگا ہے۔ وہاں تمام خاندانی نظام ختم کر دیا گیا ہے۔ میں جب اس صورتحال کو دیکھتا ہوں تو مجھے ڈر لگتا ہے اور مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کل وہ شاید چوری کو بھی جائز قرار دے دیں اور استدلال یہ پیش کریں کہ اکثریت اس کے حق میں ہے۔

ادراک: پاکستان میں جس انداز سے 58 برس سے جمہوریت پنپ رہی ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں اور

اگر نہیں ہیں تو اس کے کیا اسباب ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میں کیا آپ بھی اس سے مطمن نہیں ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی شخص بھی پاکستان میں انداز جمہوریت سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں جمہوریت آتی ہے اور جاتی ہے۔ یہاں یہ ڈرامہ ایک طویل مدت سے ہو رہا ہے۔ ہم کب سے آس لگائے بیٹھے ہیں کہ یہاں کوئی جمہوری حکومت ہو' یہاں کبھی جمہوریت Stable ہو اور کوئی انداز حکمرانی Stable ہو۔ لیکن یہ ہمارا خواب ابھی ادھورا ہے۔ ہم اس کو قطعاً ایک جمہوری ملک نہیں کہہ سکتے ہیں۔ یہاں جمہوریت کبھی مضبوط ہو ہی نہیں سکی ہے۔ لہٰذا ہم اس ملک کو جمہوری ملک قرار نہیں دے سکتے۔ یہاں جمہوریت کو استحکام حاصل نہیں ہے۔ یہاں جمہوریت کو ایک تسلسل کے ساتھ چلنے نہیں دیا گیا۔ یہاں مسلسل فوج کی حکمرانی ہے۔ یہاں جمہوری نظام برابر دو تین سال کے بعد ختم کر دیا جاتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت اس ملک میں زور آور اور غالب دستوں کی خیرات ہے۔ جو یہاں کے عوام کو گاہے گاہے دی جاتی ہے۔ یہاں جمہوریت اپنی حقیقی شکل میں نہیں ہے۔ یہاں دس سال جنرل ایوب خان' گیارہ سال جنرل ضیاء الحق رہے اور اب پانچ چھ سال سے جنرل پرویز مشرف موجود ہیں۔ اگر آپ ٹائم فریم میں دیکھیں تو یہ کوئی جمہوریت نہیں ہے۔ یہ تو کچھ طاقتور لوگ اپنی Justification کیلئے یہاں کے عوام اور لوگوں کو تھوڑی دیر کیلئے سانس لینے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ آپ اس کو جمہوریت کا نام نہیں دے سکتے ہیں۔ جس نظام میں ایک تسلسل نہ ہو' جو آدھا کچا پکا نظام بھی نہ ہو' جس میں ہر روز نت نئی غیر ضروری تبدیلیاں کی جا رہی ہوں اور جو عوام کے حقوق سلب کرنے کے مترادف ہو اسے جمہوریت کا نام دینا باعث شرم ہے۔

ادراک: یہ بعض سنجیدہ حلقوں کا خیال ہے کہ ہمارے ہاں جمہوریت کو آزادی سے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع ہی نہیں فراہم کیا گیا ہے۔ اور ہمارے ملک میں ہمیشہ جمہوریت کا پودا آمریت کے گملے میں لگایا گیا ہے۔ کیا آپ اس سوچ سے سے اتفاق کرتے ہیں۔ یا آپ کی رائے اس سے مختلف ہے؟۔

پروفیسر احمد رفیق اختر: میں یہ نہیں کہتا کہ آمریت نے جمہوریت کا پودا اپنے گملے میں لگایا ہے۔ میرا یہ ہمیشہ سے خیال ہے کہ (جمہوریت) آمریت کا Guilt conscience ہے۔ وہ اپنے جرائم کی تسکین جب کسی اور جگہ سے حاصل نہیں کر پاتے تو وہ اس سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کیلئے عوام کو تھوڑی مدت کیلئے بلدیاتی الیکشن کا ہنگامہ دے دیتے ہیں۔ اور اس سے وہ صرف اپنے ضمیر کے مجرمانہ احساس کو مطمئن کرتے ہیں۔ یہاں فوج نے کبھی جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا ہے اور نہ کبھی جمہوری روایات کی اس نے پاسداری کی ہے۔ فوج نے کبھی اپنے ملک کے آئین کا احترام بھی نہیں کیا۔ آج تک ہماری آرمی نے زمین و آسمان کی کسی جمہوری قدر کی پرورش اور قدر نہیں کی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ اور جھوٹ ہے کہ ہماری فوج جمہوریت پسند ہے اور عوام دوست ہے۔ اس طرح کی سوچ شیخ رشید احمد اور کم علم لوگوں کی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن سمجھدار اور فہیم لوگوں کا یہ خیال نہیں ہو سکتا ہے۔

ادراک: ہماری ملکی سیاست اور جمہوریت کے سفر میں کچھ حد سے زیادہ ہی ہماری فوج کا عمل دخل رہا ہے اور سیاسی بصیرت کے حامل کچھ حلقے فوج کی اس مداخلت کو بھی جمہوریت کی ناکامی کا سبب گردانتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب اس کی ایک History ہے بنیادی طور پر ایک لاہور تک باڈر ایریا تھا اور یہاں چھاؤنیاں تھیں۔ بلکہ ملک تو شاید لاہور سے آگے شروع ہوتا تھا۔ اسی طرح مشرق

> **لوگ تو کہتے ہیں کہ آپ ماشاء اللہ فلاسفر' دانشور اور صوفی ہیں۔ آپ کو یہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شاہ صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ وہ فلاسفر' دانشور اور صوفی تو اہل کوفہ سے بھی بدتر ہوا جو بیٹھ کر سب کچھ دیکھتا رہے جو اس کے ارد گرد غلاظت کے انبار ہیں اور پھر وہ یہ سوچتا رہے کہ وہ بڑا عظیم فرد ہے اور لوگ بڑے بدتر ہیں۔**

پنجاب جو سکھوں کا علاقہ ہے اور یہ کبھی سنٹرل انڈیا کی پائیداری کا حصہ نہیں بنا ہے۔ This is always considered to be a border area. یہ تمام شہزادوں اور آریا جنگجوؤں کی ہن وغیرہ کے حصول کی تگ و تاز کا میدان رہا ہے اور اس میں لوگوں نے آزادی سے سانس لینے کیلئے نہیں بلکہ غلامی سے سر جھکا کر زندگی گزارنے کے آداب سیکھے ہیں اور آج بھی اگر آپ غور کریں تو یہی طریقے ہم اپنا رہے ہیں۔ ہم طاقت کو اب بھی Appreciate کرتے ہیں۔ ہمارے خوش قسمتی ہے کہ اگر کوئی آمر مہربان نکل آئے۔ اس کیلئے مغلیہ دور میں ایک لفظ استعمال ہوتا تھا۔ تاریخ اس لفظ کو بار بار دھراتی ہے کہ It was a benevolent despotism. ہم مہربان آمریت کے ہم خواب دیکھتے ہیں۔ ہم کبھی بھی جمہوریت کے خواب نہیں دیکھتے ہیں اور ہماری ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہم پہ مہربان رہیں۔ لہٰذا یہ لوگ ان علاقوں پر خونخوار ظالموں کی طرح اترے ہیں۔ اب یہی کام ہماری پولیس ماشاء اللہ بصد شوق انجام دے رہی ہے۔ میں اپنے لوگوں میں علاقائی' سیاسی اور علمی تشخص اور قومی جمہوری خصوصیت کا رنگ جو ہماری پہچان ہے' بہت کم دیکھتا ہوں۔ میں اب اس ملک میں ہزاروں افراد ایسے دیکھتے ہوں جو ہر معاملے میں انڈیا سے مفاہمت کی بات کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی اس خصوصی منطق کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ ہمارا اور انڈیا کا علاقہ اور زمین ایک جیسی ہے۔ لہٰذا ہمارا کلچر بھی ایک ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کی اس Approach کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ

We Are not Truly Committed people.

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم میں ایک آزاد مملکت کے آزاد باشندے ہونے کا احساس بھی ابھی تک اجاگر نہیں ہوا ہے اور ہم ابھی تک ایک قوم نہیں بن سکے ہیں۔ I Think ,there is a need for us to become a nation,which we are not as yet.

ادراک: فوج ہمارے ملک کا ایک محترم اور منظم ادارہ ہے ہماری ملکی سیاست میں اس ادارے کی حد سے بڑھی ہوئی اور ضرورت سے زیادہ عمل داری اور مداخلت کیا ایک بین الاقوامی سازش نہیں ہے۔ کہ جس کا مقصد ہمارے ملک کے لوگوں اور فوج کے درمیان شدید نفرت' سیاسی عناد اور علاقائی تعصب کو راسخ کر کے قومی سلامتی کو نقصان پہنچانا ہے۔ ہماری فوج کے ارباب بست و کشاد اس پہلو پر کیوں نہیں سوچتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ہماری فوج محترم ہے اور نہ مقدس ہے۔ اگر ہماری فوج کے کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ ہمارا یہ رویہ ہمارے مذہبی اخلاق کی پیداوار ہے تو یہ ایک فکری مغالطہ ہے۔ ہمارے ذہن میں اپنی پاک فوج کے متعلق تصور انگریزوں اور امریکیوں کی فوج جیسا نہیں ہے بلکہ ہم اپنی فوج کو جنگ لڑنے والے مسلمان مجاہد اور غازی سمجھتے ہیں۔ جو ہمارے آباؤاجداد کی اعلیٰ جنگجویانہ سنہری روایات اور وراثت کے امین ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ فوج اپنے مخصوص انداز' اطوار' وردی اور ٹوپی کیلئے محترم نہیں ہے۔ بلکہ ہم ان کا احترام اس لئے کرتے ہیں کہ ہم انہیں مجاہد سمجھتے ہیں۔ اور ان کے پاس جو اسلحہ اور ہتھیار ہیں' ان کو اپنے وطن کے دفاع اور محافظت کیلئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ ہم وہ مسلمان ہیں جنہوں نے اللہ کے نام پر لڑنے اور مسلمانوں کی حفاظت کرنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری موجودہ حکومت نے اس مقدس عہد اور منفرد فلسفے کو کرپٹ کر دیا ہے۔ لہٰذا جب اس نظریے کو نقصان پہنچے گا تو یقیناً فوج کا احترام بھی مجروح ہوگا۔

ادراک: شہنشاہیت اور آمریت سے جمہوریت بہتر ہے لیکن جمہوریت اسلام کے مقابلے میں ہر اعتبار سے محدود اور نامکمل ہے

لیکن کیا وجہ ہے کہ آج دنیا میں ستاون اسلامی ملک ہیں لیکن کسی ملک میں بھی اسلام کا نفاذ تو درکنار جمہوری حکومت کا قیام بھی ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

پروفیسر احمد رفیق اختر: اسلام کو اس ابتر حالت میں پہنچتے ہوئے ایک طویل عرصہ لگا ہے۔ کوئی بھی نظریہ اتنا طاقتور نہیں ہوتا ہے کہ اس کو باقی رہنے میں صدیاں لگ جائیں۔ ہمارے اختلافات پرسنل اور Communal ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومتیں سیکڑوں برس تک قائم رہی ہیں اور ہمیشہ سے ایک پاورفل مذہب رہا ہے۔ اس وقت تمام مسلمان حکومتیں اپنے کرتوتوں اور قرآنی فلسفے سے دوری کے نتیجے میں ناکام ہیں۔ بہرحال دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی اور سسٹم اور تصور اتنا طاقتور نہیں نکلا ہے۔ جس میں مخصوص تشخص سے پوری دنیا کو اتنی زیادہ مدت کیلئے مغلوب رکھا ہو۔ آج تیرہ سو برس کے بعد یقیناً اخلاقی، فکری، تعلیمی، معاشی اور سائنسی انحطاط کے سبب مسلمانوں کے اقتدار کا ستارہ گردش میں ہے۔ مسلمانوں کا یہ زوال ابھی رکا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام اور قرآن کی روح کو بھلا دیا ہے۔ اور غلامی کے ساتھ زندگی گزارنے کو اپنا شیوہ بنا دیا ہے۔ اس زوال اور انحطاط کا اثر اس وقت تک رہے گا جب تک اسلام کے اعلیٰ ترین اخلاقی اور علمی نظام کو دوبارہ اپنی زندگیوں کا لازمی حصہ نہیں بنائیں گے۔ اگر ساری دنیا مل کر یو این او بنا سکتی ہے تو ہمارے پاس پہلے سے خلافت اسلامیہ کا ایک Concept موجود ہے مگر ہم یہ نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا داخلی زوال علیہ ابھی تک جاری ہے۔ جب تک ہم اس زوال سے باہر نکل کر علم کی حقیقی حکمرانی کو قائم نہیں کریں گے، ہم اس وقت تک دنیا میں ایک معزز قوم کی طرح پھر سے نہیں ابھر سکیں گے۔

ادراک: قائداعظم نے ہمیں غلامی سے نجات دلائی ہے اور وہ ہمارے Librator ہیں۔ لیکن قیام پاکستان اور انکی رحلت کے بعد آج تک یہاں جمہور کو حقیقی اقتدار حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ حالانکہ قائداعظم نے یہ ملک صرف اور صرف انسانی بنیادی حقوق سے محروم طبقات اور غریب عوام کیلئے ہی تو بنایا تھا؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب قائداعظم Dispensable تھے۔ انہوں نے ہمیشہ نہیں رہنا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے اور لوگ اپنے Emotional stand سے واپس جاتے تو شاید قائداعظم اپنے اس ٹھاٹ کو Revised کرتے کہ انہوں نے یہ ملک مسلمانوں کیلئے بنایا ہے۔ یا نوزائیدہ جاگیرداریاں بنائی ہیں۔ قائداعظم کو اللہ نے نہایت مناسب وقت میں اس ناشکرگزار قوم سے جدا کر دیا تھا۔ ہم ان کے بعد ان کی تربیت کا کچھ اثر تو دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی مکمل سوچ اور فلسفے کا عکس کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ہمیں قائداعظم کے بعد اپنی قومی تاریخ میں گورنر جنرل غلام محمد جیسی شخصیت بھی دکھائی دیتی ہے جنہوں نے آغاز ہی سے اس ملک میں متضاد نظریات اور اقتدار کے حصول کی کشمکش کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ یہ میدان ان لوگوں کے ہاتھ چلا گیا جن کی تعداد زیادہ تھی۔ اور یہ لوگ اس ملک کی نظریاتی اساس سے Committed نہیں تھے۔ تحریک پاکستان میں جن لوگوں نے بے پایاں قربانیاں دی تھیں، ان میں سے زیادہ تر انڈیا ہی میں رہ گئے تھے۔ اور جو موقع پرست اور پیشہ ور اقتدار پرست تھے ان کی ایک کثیر تعداد پاکستان آ گئی تھی۔ پھر ایک زمیندار کلاس ان کی مددگار بن گئی اور رفتہ رفتہ یہاں اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ چلا گیا ہے جو عوام دوست نہیں تھے۔ لہٰذا پھر یہاں ایک ایسا Mercenary Attitude غالب

> حیران کن بات ہے کہ ان پڑھ اسمبلی کے سیاست دانوں میں سے کوئی دو چار صاحب کردار نکل آتے تھے لیکن اس پڑھی لکھی گریجویٹ اسمبلی سے ایک صاحب کردار ملنا مشکل ہو گیا ہے۔

آ گیا۔ جو سرحدوں پر عام طور پر فوجیوں کا ہوتا ہے۔ کہ ان کو عام لوٹ مار سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

ادراک: آج پوری امت مسلمہ، امپریل ازم اور ڈکٹیٹرشپ کے زیرنگیں ہے اور ان ستاون اسلامی ملکوں کے بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنے عوام کو جمہوریت کے ثمرات سے آشنا نہیں ہونے دیا ہے۔ تو پھر ہم پوری دنیا پر ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے والے امریکہ کو کیوں کر مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں۔ کیا ہمیں امریکہ کی آمریت اور ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے پہلے اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکنا چاہیے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: دنیا میں کوئی ایسا مجبور و مقہور معاشرہ نہیں گزرا ہے کہ جو بظاہر تو آمر کے ساتھ ہو لیکن معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے دل میں اس آمر کے زوال کی خواہش نہ مچلتی ہو۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سارے لوگ آمریت کے ساتھ ہیں جیسے پہلے زمانوں میں بھی تھے۔ مگر آج تک میں نے یہ نہیں دیکھا کہ کسی آمر کے زوال پر کسی نے آنسو بہائے ہوں۔ ہمیشہ لوگ مجبوراً بظاہر آمر کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن دل سے اس کی تباہی و بربادی کی دعائیں مانگتے ہیں اسی طرح کی صورتحال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے

یعنی لوگ آمر کے ظلم پر صبر کرنے اور پھر اس کی تباہی پر خوشیاں منانے اور بانٹنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب یہ لوگوں کا ایک مستقل رویہ بن گیا ہے۔ یعنی آمر کی خوشامد اور تسلیم و رضا کیلئے مصلحتاً لوگ ہر طرح کی صورت قبول کر سکتے ہیں۔ سیکولر ہو سکتے ہیں۔ کیمونسٹ ہو سکتے ہیں۔ دل سے اس گھڑی کا انتظار بھی کرتے ہیں کہ کب ایک آمر کی قبر پر خوشیوں اور مسرتوں کے پھول نچھاور کریں گے۔ اس اعتبار سے وہ بادشاہ کتنا بدنصیب ہوتا ہے کہ جس کے تخت پر متمکن ہونے کے ساتھ ہی عوام کے دلوں میں اس کے زوال پذیر ہونے کی آرزو جاگ اٹھتی ہے۔

ادراک: اب آخر میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کی نظر میں امت مسلمہ کا مستقبل کیا ہے اور کیا امت مسلمہ اپنے اجتماعی غیر جمہوری اور غیر اسلامی انداز فکر و نظر اور انداز حکمرانی کو تبدیل کئے بغیر اپنی موجودہ سیاسی اور معاشی حالت بدل سکتی ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: اگر آپ امید کی بات کرتے ہیں تو اب یہ مسئلہ امت مسلمہ کا نہیں رہا ہے۔ امید تو کسی بھی نظام سلطنت کی بقا کے سلسلے میں کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک جمہوریت اور دوسرے نظام ہائے حکومت کی حالت کا مسئلہ ہے۔ ہر طرف مایوسی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے ہم زمین کے Crux کے اوپر رہ رہے ہیں۔ اور نیچے کیا ہے آپ کو بھی اس کا علم ہے۔ کہ لاوے ابلتے ہوئے دریا اور سمندر ہیں نور ہے اور آگ کے شعلے ہیں۔ دھاتیں پگھلی ہوئی پڑی ہیں اور زندگی ناممکن الوجود ہے۔ لیکن اس Crux کے اوپر جو ہم رہ رہے ہیں اور ہمارے سیاستدانوں کو حکومت کرنے کے موقع مل رہا ہے۔ اور زندگی کی رونقوں اور خوشیوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ یہ اللہ ہمیں ایک موقع دے رہا ہے۔ کہ شاید زمین کے حالات اور زندگی کی یہ مختلف صورتیں بدل جائیں۔ مگر یقیناً ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس زمین پر مسلسل اخلاق کے تمام ضابطے معدوم ہو رہے ہیں۔ معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔ فیملیز کا نظام ختم ہو رہا ہے۔ بے نام و نشان بچوں کی تعداد بے حد و شمار ہے۔ یہاں تمام نظام ہائے زندگی شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب اس پورے اس انسانی معاشرے کو ایک بہت بڑی تبدیلی اور انقلاب سے گزرنا ہے۔ اس کی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ضرور عروج حاصل ہوگا۔ انہیں ایک بار پھر Return ملے گا۔ اور اب اس تبدیلی کو یقیناً امام مہدی علیہ السلام کی صورت میں آنا ہے۔ ■